ملّت کا اسلام دوست احیاء

ڈاکٹر بلال مسعود ○

آج اگر استعماری قوتیں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے مستقبل کی صورت گری کا اختیار رکھے ہوئے ہیں، تو اس کی بظاہر وجہ یہی ہے کہ یہ قوتیں ہماری دنیاوی کمزوری کی وجہ سے ہم پر حاوی ہوگئی ہیں ۔ غیر ملکی استعمار کے مقابلے میں دنیاوی طاقت حاصل کرنا ہمارا اور ہمارے حکمرانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ مگر دوسری طرف ہمارے یہی حکمران، ہمارے ہاں مسلط غاصب طبقے میں بھی شامل ہیں، الا ماشاءاللہ۔ غاصب طبقے کی اجارہ داری کی وجہ شاید آج کی مسلم امہ کی علمی و ذہنی پس ماندگی اور فکری انتشار ہے۔ اور اگر یہ غاصب طبقہ اسلام کے لیے رکاوٹ بھی ہے تو یہ مغرب کی سائنسی ترقی سے مرعوبیت کی وجہ سے ہے ۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا کہنا ہے کہ یہ طبقہ مسلمان اقلیتوں کا بھی سیاسی اور ثقافتی راہنما ہے۔ (ترجمان القرآن، اکتوبر ۲۰۰۱ء)

ہماری پسماندگی معاشی ہو، سائنسی ہو یا ذہنی، ایک دنیاوی کمزوری ہے۔ دنیاوی حالت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی مثال صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے، جس کا ذکر مولانا مودودیؒ نے تفہیمات (حصّہ اول) کے مضمون 'آزادی کا اسلامی تصور' میں کیا ہے، اور پھر 'رسولؐ کی حیثیت شخصی وحیثیت نبوی' میں۔ پہلے مضمون میں مولانا مودودی مرحوم لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ حضور نے مدینے کے باغبانوں کو کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپؐ سے اس بارے میں عرض کیا گیا تو جواب میں آپؐ نے فرمایا: تمھیں اپنے دُنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے''۔ آخری فقرہ اور حوالہ دوسرے مضمون میں ہے۔ یہ ایک دنیاوی مسئلہ

○ سابق ڈائریکٹر، مرکز برائے ہائی انرجی فزکس، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

تھا، جو ایک دنیاوی تجربہ چھوڑنے سے پیدا ہوا۔ دنیاوی علم کا ذکر صرف ایک حدیث میں ہی نہیں۔ ایسی پانچ مزید احادیث مبارک مولانا کے اِس پہلے مضمون ہی میں ہیں۔

مولانا مودودی بتاتے ہیں کہ جنگِ بدر کے موقع پر خیموں کی جو جگہ حضرت خباب بن منذرؓ نے (دنیاوی تجربے سے) تجویز کی اس پر عمل بھی کیا گیا۔ پیوندکاری اور خیموں کے علم کو عقلی علم کہیں، دنیاوی کہیں، یا آج سائنسی یا تجرباتی علم کہیں، یہ قرآن وسنت یا اسلامی علم سے مختلف ہے۔ ایسا کہنا ایک زُمرہ بندی (categorization) ہے۔ یہ تقسیم کوئی سیکولرزم یا گمراہی نہیں قرار دی جاسکتی۔ سیکولرزم تب ہے اگر دنیاوی علم دین کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اسلامی روایت میں نقلی اور عقلی (دینی اور دنیاوی) علوم کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان دونوں طرح کے علوم میں کوئی فرق تو ہے جس کی وجہ سے یہ بحث کرنا پڑی۔ اس لیے یہ فرق ماننا نہ گمراہی ہے اور نہ سیکولرزم۔

دنیاوی علم اسلامی حدوں کا منطقی تقاضا ہے، کیونکہ ایک پابندی کی پیروی کے کئی طریقے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اسلام نے کھانے پینے میں حرام سے منع کیا ہے۔ اب حرام کی کوئی فہرست یہ نہیں بتاتی کہ حلال کیا کیا ہے؟ مثلاً 'سُور نہیں کھانا' ایک پابندی ہے۔ مگر اِس (اور دوسری اسلامی پابندیوں) کی خلاف ورزی کیے بغیر آپ جائز میں سے کچھ بھی کھا سکتے ہیں، جیسے چاول، روٹی، سالن، پھل، سبزی، وغیرہ۔ (بدر میں خیموں کی جگہ کی طرح) جائز کھانوں میں انتخاب ایک دوسرے 'علم' (جیسے میڈیکل سائنس) کا موضوع تو ہوسکتا ہے، اسلام کا نہیں۔ یہ ایک علم میں دوسرے علم کی گنجایش کی مثال ہے۔

اسلام بہت سی تفصیلات انسانی تجربے (دوسرے علم) کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم دو جائز کاموں میں سے اُس کا انتخاب کرسکتے ہیں، جس کے حق میں تجرباتی گواہی زیادہ ہو۔ اسلام میں سائنس کی گنجائش اس طرح سے ہے۔ اسلام میں مباح (جائز) کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں سائنس اور دیگر انسانی علوم کو وہ پوری آزادی مل سکتی ہے، جو ان کے لیے ضروری ہے۔ مسلمانوں کی دنیاوی کمزوری دُور کرکے انھیں اتنا طاقت ور بنانا کہ استعماری قوتیں ان پر حاوی نہ رہیں، ایک دنیاوی مسئلہ ہے۔ اس کو حل کرنا سائنس یا سماجی علوم کا بھی کام ہے۔ اور یہ بھی شاید ایک دنیاوی یا انسانی مسئلہ ہی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قابلیت کیسے پیدا کی جائے کہ غاصب طبقے انھیں بے وقوف نہ بناسکیں؟

اگست ۲۰۲۴ء کے ترجمان القرآن میں مضمون نگار سید سردار علی صاحب، اسلامی تہذیب کو درپیش مشکلات کے انسانی حل کی بات کرتے ہیں، اور سائنس ایک انسانی علم ہے۔ سردار علی لکھتے ہیں: ''کوئی سا بھی اخلاقی نظام ہو، انسان اپنے اظہار کے لیے بہرحال اسی مادی دنیا کے اسباب اور وسائل کا محتاج ہوتا ہے...... اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کی وہ تمام کوششیں، جو مسلم دنیا اور مسیحی مغرب کے درمیان فوجی طاقت، مادی دولت، اور ثقافتی اثر ورسوخ کے مسلسل بڑھتے ہوئے فرق کی تشخیص کے لیے تھیں، سودمند ثابت ہوتیں کیونکہ یہ تشخیص انسانی معاشروں کے عروج وزوال کے معروضی اور آفاقی پیمانوں کے بجائے صرف عقائد کے زیرِاثر، جزوی، یا سطحی مفروضوں پر مبنی تھی''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: ''دُنیا بھر کے مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ صرف دینِ اسلام کی راہ سے بھٹکنا ان کی اس کمزوری کا سبب نہیں ہے...... جب تک مسلمان تجزیے اور اصلاحِ احوال کی کوششوں کو ان مبادیاتی غلطیوں سے پاک نہیں کریں گے، اُس وقت تک، اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے لیے مسلمانوں کی سب کوششیں ماضی کی طرح لاحاصل ہی رہیں گی...... مسلمانوں کے اندر ایسے نظریات نہیں پنپ سکے جو انھیں اطمینان دلاتے کہ سائنس، عقل اور سماجی ارتقاء سے حاصل کیے گئے ذرائع کا استعمال کوئی غیر اسلامی عمل نہیں ہے...... جدید ٹکنالوجی، جدید تصورات اور جدید ادارے جب کبھی مسلم معاشروں میں راہ پاتے ہیں تو ان کو بے دلی سے اپنایا جاتا ہے، جس سے کسی بہتری کا امکان نہیں پیدا ہوتا''۔ مادی دنیا کے اسباب کا مطالعہ سائنس کا موضوع ہے۔ اس میں انسانی معاشروں کے عروج وزوال کے معروضی اور آفاقی پیمانوں کا مطالعہ سماجی علوم (سوشل سائنسز) کا کام ہونا چاہیے، جن میں معاشیات، بشریات، نفسیات، معاشریات اور سیاسیات شامل ہیں۔ یہ صرف دو افراد یعنی راقم اور سیّد سردار علی کی تشخیص اور رائے نہیں ہے۔

یہی بات جب اخوان المسلمون کے سابق مرشد عام حسن الہضیبی نے اپنی کتاب دعاۃ لا قضاۃ (ہم داعی ہیں قاضی نہیں) میں لکھی ہے تو بہت سی ایسی مثالیں دی ہیں جن کا سائنس ہونا واضح ہے۔ اس کتاب کی چوتھی فصل (بعنوان: اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ) میں لکھا ہے: ''شریعت میں اعمال فرض، حرام یا جائز ہیں۔ جو چیز فرض ہے...... کسی انسان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ یہ واجب نہیں ہے...... اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے، وہ قیامت تک

حرام ہے...... جہاں تک مباحات (جائز امور) کا تعلق ہے، مسلمانوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ ضرورت کے مطابق ان میں ضابطے بنائیں، چاہے وہ فیصلہ ہو، قرارداد ہو، یا قانون ہو، تاکہ ان اصولوں کو نافذ کیا جاسکے جو عمومی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں...... اسی طرح عوامی سڑکوں پر ٹریفک کے قوانین، صحت سے متعلق حفاظتی قوانین، زرعی آفات کا مقابلہ کرنے کے قوانین، پانی کے ذرائع کے استعمال کے ضوابط، تعلیم سے متعلق قوانین، مختلف پیشوں جیسے میڈیکل سائنسز، انجینئرنگ، اور فارمیسی کے قوانین، اور ان کو انجام دینے والوں کے لیے مقرر کردہ شرائط بھی شامل ہیں۔ مزید برآں، انتظامی اداروں کو منظم کرنے اور ہر ایک کے اختیارات اور ذمہ داریوں کو متعین کرنے کے قوانین...... یہ اس بات کی نفی کے لیے کافی ہے کہ ''قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے''۔

دنیاوی قوانین، دنیاوی علم کا حصّہ ہیں، اور یہ علم ہم نے انسانی تجربے اور منطق سے سیکھنا ہے۔ دنیاوی علوم سیکھے بغیر امت کا احیاء ممکن نہیں، چاہے یہ علوم ان کے پاس ہوں جو اس وقت ہمارے دشمن ہیں۔ اس صورت حال پر ایک اچھا تبصرہ اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے سابق استاد اور معروف اسلامی محقق ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب کا ہے۔ یہ تحریر 'متاعِ گم گشتہ' کے عنوان سے ان کی فیس بک پر ہے:

''انسانی تہذیب کے ارتقاء میں ہر عہد اور ہر خطے کے لوگوں نے حصّہ ڈالا۔ مسلمانوں نے اس کی آخری ترقی یافتہ شکل کو لے کر اس پر اضافے شروع کردیے۔ وہیں سے مغرب نے اس کا آخری سرا پکڑا اور اسے آگے بڑھانے میں جت گیا۔ آج ہم تسخیر کائنات کے ناقابلِ تصور مقام پر کھڑے ہیں۔ لیکن اگر ہم اسے مغرب کی تہذیب کہہ کر رد کریں گے تو واپس غاروں میں چلے جائیں گے۔ یہ پوری انسانیت کا مشترک اثاثہ ہے اور اس کی پرورش میں ہم نے بھی خونِ جگر جلایا ہے۔ اس پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا مغرب یا کسی دوسری قوم کا ہے۔ کسی بھی انسانی ورثے کو کسی قوم کی طرف منسوب کر کے اسے ترک کرنے کی تلقین کرنا جہالت اور بے نصیبی کے سوا کچھ نہیں''۔

ڈاکٹر طفیل ہاشمی مزید لکھتے ہیں: ''البتہ جس طرح درخت ارتقائی مراحل میں بے مصرف برگ و بار اٹھا لیتے ہیں، یا انسان کے بال ناخن وغیرہ بڑھ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح تہذیب

میں بھی کچھ ایسے عناصر شامل ہو جاتے ہیں، جو ماینفع الناس کے زمرے میں نہیں آتے۔ صرف انھی کو الگ کرنا ہوتا ہے۔ مغرب میں مدون بے شمار قوانین، ادارے، نظام اسی زمرے میں آتے ہیں کہ وہ مشترکہ انسانی اثاثے ہیں اور تزئین گلستاں میں ہمارا خون بھی شامل رہا ہے۔ اس لیے جہاں آپ کھڑے ہیں اور جن قوتوں کے مالک ہیں، جو خزانے آپ کے پاس آچکے ہیں انھیں 'دوسروں کا مال' کہہ کر رد کرنے کے بجائے اپنی متاع گم گشتہ سمجھ کر اس میں اضافے کی سعی کریں۔ ایک بار ہم نے فیڈرل شریعت کورٹ میں پاکستان پینل کوڈ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس ٹیم میں میرے اور ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے علاوہ اور بھی متعدد احباب شامل تھے۔ ہم نے دیکھا کہ یہ قانون جو یہاں برٹش پینل کوڈ کے تحت رائج تھا، اس کی [کم و بیش ہر] دفعہ کسی نہ کسی اسلامی فقہ سے ہم آہنگ ہے۔ کئی صدیاں پہلے ہونے والی اس کی تدوین میں فقہ مالکی کے سکالر بھی شریک رہے''۔

بوسنیا کے پہلے (مسلمان) صدر اور معروف مصنف علیجاہ عزت بیگوویچ [م: ۲۰۰۳ء] نے اپنی کتاب *Islam Between East and West* کے دوسرے باب میں یہی بات اس طرح لکھی ہے: ''ترقی civilization میں ہوتی ہے، جس کا اہم حصّہ سائنس اور بہت سے ادارے ہیں، جب کہ مذہب اور کئی 'اخلاقی اقدار' culture کا حصّہ ہیں''۔ اردو میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی 'تمدن' میں ہوتی ہے اور اسلام ہماری تہذیب کی بنیاد ہے۔ تہذیب تو اسلامی یا غیر اسلامی ہوسکتی ہے، مگر 'تمدن' اسلامی غیر اسلامی نہیں ہوتا۔ تمدن صرف قدیم یا جدید ہوتا ہے۔ جدید تمدن کو صرف اس وجہ سے رَد کرنا کہ اس پر مغربی تہذیب کے اثرات پڑ گئے ہیں، کوتاہ نظری ہے۔

'تمدن' کا لفظ زیادہ استعمال نہیں ہوتا، اس لیے طفیل ہاشمی صاحب نے اسے مغربی تہذیب کہا ہوگا۔ استعماری قوتیں مسلمانوں کے مستقبل کی صورت گری کا اختیار اپنے پاس اس لیے رکھے ہوئے ہیں کیونکہ آج مسلمان کمزور ہیں، یعنی ہم 'تمدن' میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ مسئلہ کسی ایک گروہ یا جماعت کا نہیں ہے، اور اسے حل کرنے میں ہر ایک کو حصّہ ڈالنا ہے۔ کسی پس ماندہ ملک میں ایک عام فرد کروڑوں میں سے ایک ہوسکتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان لاکھوں میں سے ایک ہو تو ترقی کی کوشش میں اس کا لاکھواں حصّہ ہونا چاہیے۔ ایک اہم سیاسی پارٹی سیکڑوں یا درجنوں قوتوں میں سے ایک ہوگی۔ اس کو ترقی کے لیے سو میں ایک یا درجن میں سے ایک حصّہ ڈالنا چاہیے۔

ترقی کرنے کا کوئی طریقہ اگر اسلام کے خلاف ہو تو اس کا کوئی ایسا متبادل راستہ بھی ہوگا جس میں اسلام کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دوسرا متبادل اختیار کیا جائے نہ کہ پہلا۔ اس کام کے لیے جدوجہد شاید صرف اسلام دوست طبقے ہی کریں۔ مسلم اکثریتی ملکوں میں اس مقصد کے لیے دباؤ برقرار رکھا جانا چاہیے۔

مسلم اقلیتی ملکوں کے کچھ عملی مسائل ایسے ہیں، جن کا حل شاید مقامی حالات کے مطابق ہی سوچا جاسکتا ہے۔ فکری اقدامات اس صورت حال کے لیے سوچے جاسکتے ہیں کہ مسلمانوں کی دنیاوی حالت مناسب ہو اور ان کا بڑا مسئلہ اپنے عقائد اور تہذیب کی حفاظت ہو۔ ایک وقت میں بھارت میں بھی مسلمان اس مسئلے پر توجہ دینے کے قابل تھے، اور وہاں ڈاکٹر ذاکر نائیک اور دیگر افراد نے اسلامی عقائد کے پھیلاؤ کے لیے بڑا مؤثر اور چیلنجنگ کام کیا۔ بھارت میں اسلام پر پابندیاں زیادہ شکلوں میں سامنے آئی ہیں، مگر فرانس وغیرہ میں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

تاہم، مغربی ممالک میں اپنا پیغام پھیلانے کی آزادی ہے۔ یہاں اگر مذہب کے خلاف لکھا اور کہا جارہا ہے تو مذہب کی حمایت میں بھی آوازیں اور تحریریں کچھ کم نہیں۔ دونوں طرف پہلا موضوع عیسائیت ہی ہے۔ لیکن اگر ایک عیسائی مبلغ اِن عقائد کے حق میں اچھا اور مؤثر لکھے جو اسلام اور عیسائیت میں مشترک ہیں (جیسے خدا کا وجود، انسانی روح اور کچھ مذہبی اخلاقیات)، تو ہم اس مشترکہ کام کو استعمال کر سکتے ہیں، کم از کم فلسفے، ریاضی اور سائنس کے نام سے ان پیچیدہ سوالوں کے جواب دینے میں جہاں خود آج کے بہت سے مسلمان علما تفصیلات میں جانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

مسعودہ بانو کی کیمبرج یونی ورسٹی سے شائع شدہ کتاب (۲۰۲۰ء): The Revival of Islamic Rationalism کا ایک مجموعی تاثر یہ ہے کہ: مشرق کے مقابلے میں مغربی معاشروں میں زیادہ ذہین افراد اسلامی علوم حاصل کرنے کے لیے زندگیاں لگا رہے ہیں اور کئی تعلیمی ادارے بھی قائم کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ مغرب میں نسبتاً معاشی بے فکری ہوسکتی ہے۔ اسلامی عقائد کے لیے جس طرح ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بھارت میں کام کیا تھا، اب یورپ میں حمزہ زوٹز (Hamza Tzortzis) اور دیگر حضرات یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مغرب میں مذہب کے حق میں دلائل کا منطقی معیار ہے۔ مگر یہ سارا علمِ کلام ابھی تک روحانیت، مناظرہ بازی یا موجود تحریریں اکٹھا کرنے سے

اُوپر اُٹھ کر انسانی تمدن کے ارتقاء کو اسلامی راہنمائی دینے کے مرحلے میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اس مختصر تحریر میں ہم یہ عرض کرچکے ہیں کہ اسلام میں ایک دوسرے علم (سائنس) کی گنجایش ہے۔ اسی انداز سے سائنس اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ایک تہذیب اور ہدایت کی منطقی گنجایش کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اور لازمی طور پر کی جانی چاہیے (ایک سائنسی اصول کی پیروی بھی کئی طرح سے ممکن ہے)۔ انسانی، روحانی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں رہنمائی کے لیے اسلام نے جو ہدایت عطا فرمائی ہے، اس کا فہم اور روحِ عصر کا چیلنج ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

بہرصورت، امت مسلمہ کی احیاء کی کسی بھی بحث میں پہلا موضوع 'اسلام اور دنیاوی علوم کا تعلق' ہونا چاہیے۔ دُنیاوی علوم میں سائنس، سماجی علوم اور انسانی اقدار شامل ہیں۔ مسلم اکثریتی ممالک میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسلام کی خلاف ورزی کیے بغیر دنیاوی علوم کو ترقی کے لیے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے!